تصدیق
جلد۰۱ شمارہ۰۵، ۲۰۲۳

Article

DR. TABASSUM KASHMERI'S LITERARY HISTORICAL CONSCIOUSNESS

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا ادبی تاریخی شعور

(اردو ادب کی تاریخ۔۔ابتدا سے ۱۸۵۷ تک، کی روشنی میں)

Hafiza Ayesha Sadiqa[1], Dr. Ataurehman Meo*[2], Dr.Rehana Kausar[3]

[1] Ph.D. scholar Lahore college for women university,[2]Associate professor Lahore garrison university,
[3]HOD,Urdu department,Lahore college for women university, Lahore
*Correspondence: dratta786@gmail.com

[1] حافظہ عائشہ صدیقہ،[2]ڈاکٹر عطاء الرحمن میو،ڈاکٹر ریحانہ کوثر

[1]لیکچرار، پی ایچ ڈی سکالر، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی،[2]ایسوسی ایٹ پروفیسر، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور، 3صدر شعبہ اردو، لاہور کالج ویمن یونیورسٹی، لاہور

ABSTRACT: Literary historiography plays a significant role in providing facts about the origin and evolution of different phases of literature. Many books has been written about literary history of Urdu. Among all of them,which has written in twentieth century ,Urdu abad ki tareekh written by Dr. Tabassum Kashmiri(in the beginning of twenty first century) is very important and has its own sigficant values due to many reasons. Dr.Tabassum Kadhmiri wrote this literary history in very interesting way especially to entertain the students of Urdu literature. It is organized in nineteen chapters.Many critics agreed on a opinion that it is far better than other literary histories of urdu for many analytical and critical point of view. In this article an attempt has been made to overview the analytical ,critical, and literary vision of Dr.Tabassum Kashmiri.

eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210
DOI:https://doi.org/10.56276/tasdiq.v5i01.156
Received:21-05-2023
Accepted:07-07-2023
Online:10-07-2023

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

KEYWORDS: Tabassum Kashmiri, Literacy, Historical, Consciousness, Opinion, Phases, Analytical, Origin, Evolution, Literary Historiography

ادبی تاریخ کی حیثیت عام تاریخ سے منفرد ہوتی ہے۔اس میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے جس میں واقعات ،اقدار، حقائق ،رجحانات ،اثرات اور دیگر محرکات شامل ہوتے ہیں جن سے مل کر ادبی تاریخ کی تشکیل ہوتی ہے۔ادبی تاریخ میں فکری ،تہذیبی، معاشی، معاشرتی، لسانی، سماجی اور عوامی اثرات ایک دوسرے سے مل کر ایک وحدت کا تاثر دیتے ہیں۔ادبی تاریخ تمام حقائق کو یوں منظر عام پر لاتی ہے کہ کڑی سے کڑی مل کر پوری تصویر کے نقوش واضح دکھائی دینے لگتے ہیں۔ادبی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ متعلقہ عہد کی تاریخ میں کس طرح کا ادب پنپتا رہا، اس کی بنیاد کیا تھی، یہ کن محرکات اور رجحانات کا عکاس ہے۔یہ ادب کے مختلف گوشوں کو منور کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معیشت، نفسیات، سماجیات اور ثقافت کی بھی تصویر کشی کرتی ہے، جو اس عہد کے سماج کو سمجھنے اور زندہ جاوید بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ان پہلوؤں کو محیط ادبی تاریخ جدید تاریخ نویسی کے تصورات اور معیارات پر پورا اترتی ہے۔

اردو ادب میں تاریخ نویسی کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں نظر آتا ہے۔اس سے قبل تاریخ کے ابتدائی نقوش تذکروں ،ملفوظات اور مکتوبات کی روشنی میں سامنے آتے ہیں۔بیسویں صدی میں گراہم بیلی اور رام بابو سکسینہ کی ادبی تاریخ نے باقاعدہ ادبی تاریخ نویسی کا ڈول ڈالا، اس کے بعد بیسویں صدی میں تاریخ نویسی کا ایک مستقل رجحان دکھائی دیتا ہے جس کے باعث اردو ادب کی تاریخ کا ایک معقول ذخیرہ بیسویں صدی کی شناخت بنا۔بیسویں صدی میں جو تواریخ لکھی گئیں ان میں چند اہم اور نامور یہ ہیں:"**اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ**"(ڈاکٹر سلیم اختر)،"**اردو ادب کی تنقیدی تاریخ**"(احتشام حسین)،"**اردو کی ادبی تاریخ**"(عبد القادر سروری)،"**اردو ادب کی مختصر تاریخ**"(ڈاکٹر انور سدید)،"**تاریخ ادب اردو**"(حسن اختر ملک)،"**تاریخ ادب اردو: پانچ جلدیں**"(سیدہ جعفر، گیان چند جین) اور دیگر تاریخیں شامل ہیں۔ان تواریخ میں حقائق کی بازیافت نظر آتی ہے۔ان تواریخ میں تاریخ نویسی کے جدید معیارات کو مد نظر نہیں رکھا گیا اور یہ ادبیت کی چاشنی لیے ہوئے نہیں ہیں اس لیے قدرے خشک محسوس ہوتی ہیں کیونکہ ادبی تاریخ تحریر کرتے وقت اس امر کو مد نظر رکھنا ضروری ہے:

> "ادبی مورخ کا کام صرف واقعات اور حقائق تک محدود نہیں ہے۔وہ واقعات اور حقائق سے بڑھ کر ایک اور اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔واقعات و حقائق اور تاریخ کے مطالعہ سے وہ ادبی تاریخ کے کسی دور ،رجحان ، نظریے یا کسی شخصیت کے بارے میں ایک وژن مہیا کرتا ہے۔ادب کی تاریخ کو جو قوت ادبی تاریخ بناتی ہے وہ ادیب مورخ کا وژن ہے۔"(۱)

درج بالا اقتباس کی روشنی میں بیسویں صدی میں لکھی گئی تواریخ میں سے کسی ایک کو بھی مکمل تاریخ اس لیے قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ان مورخین کے پیش نظر عالمی سطح پر مروجہ تاریخ نویسی کے اصول نہیں تھے اور ان میں مورخین کی ذاتی پسند و ناپسند کا بھی کسی حد تک عمل دخل نظر آتا ہے۔باوجود اس کے ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اکیسویں صدی اس حوالے سے زیادہ وقیع نظر آتی ہے کہ جو تسامح، خامیاں یا کمی بیشی بیسویں صدی میں لکھی گئی تواریخ میں نظر آتی ہیں ان کو اکیسویں صدی میں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" گو کہ بیسویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی لیکن اسے اردو ادب کی تواریخ میں

اس حوالے سے اولیت حاصل ہے کہ اس میں ادبی تاریخ کے جدید معیارات کے ساتھ ساتھ مختلف اصناف کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ پہلی بار ادبی تاریخ نویسی کے بنیادی اور جدید تقاضوں پر پورا اترتی دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ کے بعد ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی **"اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک"** منظر عام پر آئی۔ اس میں تاریخ نویسی کے جدید مروجہ اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ادبی تاریخ کی تشکیل کے تمام عناصر کو یکجا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری (پیدائش: ۱۹۴۰ء) بیک وقت ادبی مورخ، نقاد، مترجم، ناول نگار، محقق اور شاعر اور پروفیسر بھی ہیں۔ ادبی تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے فرانسیسی دبستانِ تاریخ SchoolAnnales کے زیر اثر تاریخ کے مختلف ادوار کا تجزیہ کرتے ہوئے ادبی تاریخ کو ادب تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ متعلقہ عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی عوامل کو بھی مد نظر رکھا ہے۔ جہاں جہاں نفسیات اور فلسفہ کے علم کی ضرورت محسوس کی گئی، اس سے بھی کلی استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> "حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے انیلس دبستان کے مورخین نے تاریخ کو اس کے محدود کلاسیکی تصور سے رہائی دلوائی اور اسے ایک وسیع تر علمی معنویت عطا کی۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۸۹ء تک اس دبستان کی سرگرمیوں نے تاریخ کو ایک نئے رنگ و روپ سے سنوارا۔"(۲)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنی وسعت نظر، غائر مطالعہ اور تنقیدی بصیرت کی بنا پر ادبی تاریخ کے جدید تصورات کو مد نظر رکھتے ہوئے بین الشعبہ جاتی مطالعات پر زور دیا ہے جس میں متعلقہ عہد کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیومالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات وغیرہ کی روشنی میں اس عہد کا تجزیہ مکمل کیا ہے۔(۳)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ سے قبل لکھی گئی تمام ادبی تواریخ، مشفق خواجہ کے بقول تذکرہ نگاری کی حدود میں رہتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔ تذکرے تاریخ کے بنیادی ماخذ ہیں لیکن تاریخ کے لیے تمام حقائق تک رسائی نہیں کرتے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تاریخ نویسی کے سائنٹیفک اصولوں کو برتتے ہوئے تاریخی اور تنقیدی شعور کو تاریخ اور مورخ کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اور یہی عنصر ان کی تاریخ نویسی کا لازمی جز ہے جس کے باعث ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ کے بعد ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی لکھی گئی تاریخ کو مستند حیثیت دی گئی ہے۔ یہ تاریخ، تاریخ نویسی کے حوالے سے ایک الگ وژن فراہم کرتی ہے۔ اس سے قبل لکھی گئی تواریخ میں وہ جامعیت موجود نہیں ہے جو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ کا لازمی جز ہے۔ ان میں شعرا اور ادبا کے احوال اور ان کے محاسن کلام کی جمع آوری ضرور موجود ہے لیکن تاریخ کے زمانی شعور اور خارجی عوامل کی عہد بہ عہد تصویر کشی نہیں ملتی۔ اداروں کی طرف سے شائع کی جانے والی تواریخ میں چونکہ مختلف افراد شامل تھے اس لیے ان کے مضامین اسلوب بیان اور تنقیدی شعور کے اختلاف کی وجہ سے وہ تاریخی تسلسل کامیابی سے قائم نہیں رہ سکا جو ادبی تاریخ کی بنیاد ہے۔ تاریخی عناصر کو یکجا کر کے تاثر وحدت قائم کرنا ادبی تاریخ نویسی میں تاریخیت کا عنصر صحیح معنوں میں قائم کرتا ہے جس میں ادبی مرکزیت اور وسیع زمانی تناظر بھی ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے نزدیک ضروری ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ سے قبل بیشتر تواریخ لکھی جا چکی تھیں لیکن انھوں نے جن تواریخ سے استفادہ کیا ہے، ان کی فہرست درج ذیل ہے:

۱)گجرات کی تمدنی تاریخ ، ابو ظفر ندوی ۲)تاریخ گجرات ، ابو ظفر ندوی

۳)اردو ادب کی تنقیدی تاریخ ، احتشام حسین ۴)اردو ادب کی مختصر تاریخ ، انور سدید

۵)تاریخ فیروز شاہی ، ضیاء الدین برنی ۶)تاریخ ہندوستان ، ذکاء اللہ

۷)تاریخ ادب اردو ، جمیل جالبی ۸)دلی تاریخ کے آئینہ میں ، خلیق احمد نظامی

۹)دکنی ادب کی تاریخ ، محی الدین قادری زور ۱۰)اردو کی ادبی تاریخ ، عبد القادر سروری

۱۱)تاریخ ادب اردو ، رام بابو سکسینہ ۱۲)تاریخ ادب اردو (پانچ جلدیں)، سیدہ جعفر، گیان چند

۱۳)علی گڑھ تاریخ ادب اردو، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی ۱۴)تاریخ گولکنڈہ ، عبد المجید صدیقی

۱۵)تاریخ فرشتہ (چار جلدیں)، محمد قاسم فرشتہ ۱۶)تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند،(پانچ جلدیں)، مدیر عمومی فیاض محمود

۱۷)تاریخ اودھ معروف بہ تاریخ شاہیہ نیشاپور، قاسم علی نیشاپوری ۱۸)تواریخ نادر العصر ،مرتبین کارگزاران مطبع منشی نول کشور

۱۹)تاریخ ادب اردو ، کرناٹک اردو اکادمی ۲۰)تاریخ ارادت خان ، مبارک اللہ واضح

۲۱)تاریخ اودھ (پانچ جلدیں) ، نجم الغنی ۲۲)تاریخ مبارک شاہی ، یحیٰ بن سرہندی

۲۳)تاریخ آصفی ، ابو طالب اصفہانی ۲۴)تاریخ شاہ عالم ، ڈبلیو فرینکلن

۲۵)اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ ، محمد حسن ۲۶)تاریخ ادب کی تدوین ، علی جواد زیدی

۲۷)قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، محمد حسن ۲۸)مقدمہ تاریخ زبان اردو ، مسعود حسین

۲۹)فورٹ ولیم کالج: تحریک اور تاریخ، وقار عظیم

ان تواریخ کی ایک لمبی فہرست ان کی وسعت نظر اور وسیع مطالعے کی غماز ہے لیکن ماضی اور حال کی تمام تواریخ کے موجود ہوتے بھی زیادہ اخذ و استفادہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ سے نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی اس بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "مجھے عملی تنقید کو پیش کرنے کے لیے ایک تنقیدی نظام کو اختیار کرنے میں سوچ بچار کے عمل سے گزرنا پڑا۔ میرے پیش نظر ماضی اور حال کی ادبی تاریخیں تھیں۔ ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ اس اعتبار سے منفرد حیثیت کی حامل تھی کہ انھوں نے جدید نظام تنقید سے استفادہ کیا تھا۔ باقی تاریخیں تنقیدی اعتبار سے روایتی تنقید کی طرف مائل تھیں۔"(۴)

ان تواریخ کے علاوہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے پیش نظر انگریزی کی کتابیں، مختلف تذکرے اور دیگر کئی کتب تھیں جو اس بات کی غماز ہیں کہ انھوں نے حتی الوسع دستیاب مآخذ سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس عہد کے اخبارات، رسائل و جرائد جن میں اخبار چودھویں صدی، علی گڑھ گزٹ، رہبر ہند، سرمور گزٹ ناہن، رسالہ انجمن نعمانیہ، رسالہ انجمن قصور، اخبار انجمن پنجاب اور دیگر شامل تھے، ان سے اخذ و استفادہ نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ اس دور کے بنیادی ادبی مآخذ یہ رسائل و جرائد تھے۔ ان ماخذات تک رسائی کر کے اس تاریخ کو زیادہ معتبر اور موقر بنایا جاسکتا تھا لیکن باوجود اس کے مختلف ادبی مورخین کی تواریخ سے استفادہ کر کے ان کی روشنی میں جدید تاریخ نویسی کا ڈول ڈالا۔ اپنے تحقیقی اور تنقیدی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے ان مصادر منابع کی نشاندہی بھی کی جو ان ادبی مورخین کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ تاریخ اور تہذیب ایک ہی ہوتی ہے۔ ان میں موجودہ حقائق بھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں لیکن ہر ایک مورخ، محقق، نقاد کا اپنا نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی تہذیب کے دھارے مختلف مورخین کی تصویر کشی سے مختلف انداز میں بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال مرزا رفیع سودا کے حوالے سے ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے رفیع سودا کی تمام فنی حیثیتوں کو اجاگر کیا ہے لیکن ان کی شہرت دوام قصیدہ نگار اور ہجو گو شاعر کی حیثیت سے بتاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے محاسن، معنویت بخوبی بیان بھی کرتے ہیں اور ہجو گو شاعر کی حیثیت سے ان کی قدر و قیمت کا تعین بھی کرتے نظر آتے ہیں۔(۵)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری سودا کی فنی حیثیت کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین ان کے شہر آشوب اور دھیمے مدھم سُر والی غزل سے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس حوالے سے ڈاکٹر خورشید کی رائے کے ہمنوا نظر آتے ہیں کہ سودا کی غزل سے بے اعتنائی برتی گئی ہے اور یہ ناگوار حقیقت ہے کہ سودا غریب ایک عرصے سے بڑے خسارے میں ہے۔(۶)

سودا کا رنگ تغزل دھیما ضرور ہے لیکن جذبے اور تجربے کی آنچ سے بھرپور نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں کی تعداد کم تو ہے مگر ادبی اعتبار سے انتہائی اہم ہیں۔

اس کتاب کا ے زیر نظر ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا ہے ۔ کتاب کے ۱۹ ابواب ہیں ۔ آخر میں اردو ، انگریزی کتابیات درج ہیں ۔ کتابیات کے بعد مختلف سلطنتوں کی ادوار بندی بیان کی گئی ہے۔ اشاریہ میں مقامات، کتب، اسما و ادارہ جات کی درجہ بندی الگ الگ موجود ہے۔ کتاب کے کل صفحات ۸۷۲ ہیں جن میں ۸۱۹ صفحات

پر متن درج ہے۔ کتاب کا مسطر ۲۸ ہے۔ جلد دیدہ زیب ہے جو دلکش رنگوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ جلد کی پشت پر مصنف کا تعارف بھی درج ہے۔ کتاب میں موجود ۱۹ ابواب کی تقسیم کچھ اس طرح کی گئی ہے:

باب نمبر ۱ زبان کا ابتدائیہ

باب اول میں زبان کی ابتدا سے زبان کی تشکیل تک کے مختلف مراحل بیان کرتے ہوئے زبان اردو کے بارے میں مختلف محققین کے نظریات پیش کرتے ہیں۔ زبان اردو کا لسانی سفر کن مراحل میں طے ہوا اس کا احاطہ کرتے وقت اس بات کو سامنے لاتے ہیں کہ اردو کا ابتدائی نقش پنجاب میں ابھرا۔ پنجاب سے دلی آنے والوں نے اسے ایک نئی سمت عطا کی۔ اگلا مرحلہ دلی سے دیوگیر تک طے ہوا۔ حکمرانوں کی فوجی مہمات کی وجہ سے بھی مختلف لوگوں کے اختلاط واشتراک سے ایک نیا لسانی مزاج پیدا ہونے لگا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تمام واقعات حقائق کو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا ہے۔

باب نمبر ۲ شمالی ہند میں ابتدائی زبان وادب کا جائزہ

دوسرے باب میں شمالی ہند میں پنپنے والے زبان وادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے نزدیک کسی بھی زبان وادب کے فروغ میں شعرا کا کردار بہت اہم ہے۔ معدوم ہو جانے والی زبانوں کی خامی یہ تھی کہ اس زبان میں شعری ادب کا فقدان تھا۔ کسی بھی زبان کو استحکام اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے اگر اسے بدلتے ہوئے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیا جائے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس بات کے ثبوت میں مسعود سعد سلمان لاہوری کا حوالہ دیا ہے کہ شمالی ہند میں ابتدائی زبان کی ترویج میں ان کا کردار نظر آتا ہے اور حقائق انہیں اردو کا پہلا شاعر بتاتے ہیں۔ مسعود سعد سلمان کی زبان کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ابتدائی اردو زبان کے شاعر تھے لیکن ان کے ہندوی کلام کی عدم موجودگی نے اس بات کو پیچیدہ بنا دیا لیکن مورخین نے استدلال کی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ وہ نہ صرف ابتدائی اردو یا ہندوی کے پہلے شاعر تھے بلکہ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے کلام کو بھی دریافت کر لیا جائے گا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایک محقق کے طور پر اپنی صائب رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> "قیاس یہی کہتا ہے کہ مسعود سلمان کی روایت کا سلسلہ آگے ضرور چلا ہو گا نئے شعرا منظر پر آئے ہوں گے لیکن ایام کی گردش سے ان کا کلام ہم تک نہ پہنچ سکا۔ ممکن ہے اب بھی کسی گوشہ گمنامی میں ان شعرا کا کلام پڑا ہوا اور کسی محقق کا منتظر ہو اور آنے والے ایام میں یہ کلام دریافت ہو جائے۔"(۷)

شمالی ہند میں زبان کے ارتقا کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری مختلف کڑیاں جوڑتے ہوئے بابا فرید، امیر خسرو، کبیر، حضرت نوشہ گنج بخش، اور افضل کی "بکٹ کہانی" کا حوالہ دیتے ہوئے ان کا نمونہ کلام بھی پیش کرتے ہیں اور ان کے ہاں زبان وادب کے حوالے سے پائے جانے والے تجربات کا اجمالی جائزہ بھی لیتے ہیں۔

باب نمبر ۳ گجری ادب: گجرات (۱۴۰۷ء۔۱۵۸۳ء)

باب سوم میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے زبان و ادب کی تشکیل اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے متعلقہ عہد میں مختلف علاقوں میں پنپنے والے ادب کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے شمالی ہند کے بعد گجرات میں ادب کا سراغ لگانے کے لیے باقاعدہ فصل تیار کی ہے۔ چودھویں صدی میں امیر تیمور کے دلی پر حملے کے باعث مرکزیت کمزور ہونے کے باعث گجرات میں پندرھویں صدی کے آغاز میں گجرات کے صوبہ دار نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مظفر شاہ صوفیا کرام کا بے حد احترام کرتا تھا۔ گجرات میں صوفیا کے کئی خانوادے بہت مشہور بھی تھے۔ ان کے رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کو بھی ترویج ملتی رہی۔ دلی سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کے ساتھ جب مقامی لوگوں کا اشتراک ہوا تو نئے لسانی لہجے اور رویے تشکیل پانے لگے۔ اس طرح گجرات میں فروغ پانے والا ادب گوجری ادب کہلایا۔ یہاں پر موجود صوفیا نے جس زبان کا استعمال کیا وہ مقامی یعنی گجری ادب تھا اس لیے یہاں کے لوگوں کے لیے عام فہم تھا۔ اس زبان کے فروغ میں ایک یہ اہم وجہ بنی۔ جن شعرا کے حوالے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے جن کے حوالے اور نمونہ کلام پیش کیا ہے ان میں شاہ بہاء الدین باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی، خوب محمد چشتی شامل ہیں۔

باب نمبر ۴ بہمنی دور (۱۳۴۷۔۱۵۲۶ء)

بہمنی سلطنت میں صوفیا کرام کی سرگرمیاں عروج پر نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے قدیم شعری ادب پر تصوف کی گہری پرچھائیاں ہیں۔ بہمنی ریاست میں ایسے شعرا کرام ملتے ہیں جنھوں نے جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی شکل کو مقامی تہذیب و ثقافت کے رنگوں سے نکھار اور سنوار کر پیش کیا۔ اس خطے میں اس زبان کی تشکیل میں سیاسی حالات کی عمل داری نظر آتی ہے۔ محمد تغلق نے ظالمانہ، سفاکانہ سیاسی حکمت عملیوں نے سیاسی کشیدگی پیدا کر دی جس کے نتیجے میں بغاوتوں نے سر اٹھایا۔ اس سے دلی کی مرکزیت کمزور ہونے لگی۔ محمد تغلق کی ایذا رسانیوں اور سفاکانہ قتلِ عام کے باعث دیوگیر کی امیر انِ صدہ اور آس پاس کے علاقے کے لوگوں نے نہ صرف محمد تغلق کے خلاف علم بغاوت بلند کیا بلکہ یہ فیصلہ کیا کہ وہ دلی سے الگ اپنی خود مختار ریاست وجود میں لے آئیں۔ چناں چہ علاء الدین حسن بہمنی کی قیادت میں دکن کے امیر متحد ہو گئے اور خود مختار بہمنی سلطنت کے قیام کا آغاز ہوا۔ اسی دور میں اردو کا قدیم ترین ادب تخلیق ہوا۔ اردو کا لسانی سفر جس کا آغاز لاہور سے ہوتا ہوا شمالی ہند تک پہنچا پھر وہاں سے جنوبی ہند میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے لگا۔ بہمنی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی دکن کی سماجی، سیاسی و معاشی وجود ظاہر ہونے لگا اس کے ساتھ ساتھ ہر معاملے میں خود مختاری حاصل کرنے سے دکن میں لسانی خود مختاری بھی قائم ہوئی۔ محمد تغلق کے زمانے میں دلی سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کے ساتھ ان کی زبان بھی آئی جو مقامی اثرات قبول کرنے کے بعد دکنی کے نام سے جانی اور مانی گئی۔ اس دور میں ہر طرح کے تخلیقی علوم نے فروغ پایا۔ صوفیا کرام مشائخ عظام کی مجلسوں اور محفلوں نے اپنا رنگ جمایا۔ یہ تمام اثرات زبان و ادب پر بھی گہرے ہوتے گئے۔ یوں مختلف لوگوں اور تہذیبوں کے اختلاط سے عربی، فارسی، ہندوستان کی مقامی بولیوں کے زیر اثر پنپنے والی

"دکنی زبان" میں وسیع اور زرخیز ادب کا سرمایہ وجود میں آیا۔اس دور کے نمائندہ ناموں میں نظامی،خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، مشتاق، لطفی، میراں جی شمس العشاق، فیروز، اشرف بیابانی شامل ہیں۔ بہمنی ریاست کے زوال پر یہ ریاست ٹوٹ کر کئی حصوں میں تقسیم ہوئی اور نئی خود مختار ریاستوں کا قیام ہوا۔

باب نمبر۵ بیجاپور: عادل شاہی دور کا ادب (۱۴۸۹۔۱۶۸۶ء)

باب پنجم میں بیجاپور کے سلاطین علم اودب پرستی سے فروغ پانے والے نادر ادب پاروں کا ذکر کرتے ہیں۔ بیجاپور کی تہذیب گو کہ دلی اور آگرہ کی تہذیبوں سے برتر نہیں تھی لیکن علم وادب کے فروغ نے اسے اہم بنادیا۔ اس عہد میں قابل ذکر ادب کا فروغ ہوا لیکن اس کے باوجود یہ تہذیب ختم ہوگئی۔ اس کے خاتمے کی وجوہات تلاش کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اورنگ زیب کے بیجاپور پر حملے کے باعث اس کی تہذیب وثقافت ملیامیٹ ہوگئی۔ اس کے بنتے نقوش بکھر گئے۔ برہان الدین جانم نے گجری اور سنسکرتی لہجہ اختیار کیا۔ عبدل نے اپنی زبان کو ہندوی قرار دیا۔ امین الدین اعلی کی زبان برہان الدین جانم کے مقابلے میں سلیس اور رواں ہے۔ حسن شوقی کے کلام میں صوتی تکرار ہے۔ نصرتی کے ہاں شعری اسلوب اور فارسی لغت کا امتزاج ہے۔

باب نمبر۶ گولکنڈہ: قطب شاہی دور کا ادب (۱۵۱۸ء۔۱۶۸۷ء)

باب ششم میں قطب شاہی دور میں گولکنڈہ کے علم وادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حکمرانوں کا سرسری تذکرہ کرتے ہوئے گولکنڈہ میں پروان چڑھنے والے ادب کو زیر بحث لاتے ہیں۔ اس دور کے ابتدائی شعرا میں فیروز، ملاخیالی، محمود وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی روایت کی کڑیاں محمد قلی قطب شاہ کے ساتھ جاملتی ہیں۔ قلی قطب شاہ کے عہد کو پروفیسر محمود شیرانی کے قول سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری ہندوستان کا زریں ادبی دور سے تعبیر کیا ہے۔[۸]

باب نمبر۷ ولی: مرکز جو روایت کا ثمر۔۔۔دکنی غزل کا نقطہ عروج

سراج اورنگ آبادی: دکنی روایت کا نقطہ تکمیل

باب ہفتم میں سترھویں صدی میں ہونے والی لسانی تبدیلیوں کو زیر بحث لاتے ہوئے دکن میں ہونے والے تغیرات کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس تغیر کی دو اہم وجوہات تھیں مرکز گریز رویہ اور مرکز جو رویہ۔ مرکز گریز رویوں میں مقامی رنگ و آہنگ نمایاں تھا اور مرکز جو رویے کی صورت اس وقت مستحکم ہوئی جب دلی سے کثیر آبادی نقل مکانی کرکے یہاں پہنچی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے سقوط کے ساتھ ایک لسانی سیلاب کا ریلا آیا جو یہاں کی قدامت پسندی کو اپنے ساتھ بہا کرلے گیا۔ اس وقت ایک نیا لسانی ڈھانچہ تشکیل پایا جس میں دکنی ادب اور شمال کی فارسی روایت کی نزاکت اور لطافت کا اختلاط ہوا۔ اس نئے لسانی تغیر کا باقاعدہ اظہار ولی کی شاعری سے ہوتا ہے۔ ولی کے حالات زندگی اسے سیلانی طبیعت کا حامل ظاہر کرتے ہیں اسی باعث اسے جہاں گرد شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ ولی اپنی تخلیقی روشنی لیے قریہ

قریہ نگر نگر پھر تا رہا اور ہر جگہ کے رنگ کو اپنے اندر سمو کر اپنی تخلیقیت کے زور پر ایک نیا رنگ پیش کیا۔ ولی دو دھر تیوں کی روایتوں کا امین تھا۔ ولی ایک روایت ساز شاعر تھا جس نے اردو غزل کو ایک نئی کلیت عطا کی۔ اس کا سنگ میل سراج اورنگ آبادی ثابت ہوا۔ سراج کے شعری تجربوں سے اردو غزل نئی تخلیقی وسعتوں میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔

باب نمبر ۸ (الف) تاریخ کا عمل۔ اٹھارھویں صدی کا ہندوستان

(ب) جعفر زٹلی: اٹھارھویں صدی میں طنز و مزاح اور لایعنیت کا شاعر

اٹھارہویں صدی تغیرات اور انقلابات کی صدی تھی۔ سیاسی، سماجی، معاشی غرض ہر لحاظ سے ہندوستان کا نقشہ بہت حد تک بدل چکا تھا۔ مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی مسلسل یورشوں نے مغلیہ عساکر کی مجموعی صورت حال کو تباہ کر کے رکھ دیا یہاں تک کہ وہ جارحیت کا دفاع کرنے کے قابل بھی نہیں رہی۔ ایسی کرب ناک صورت حال سے عوام و خاص بھی اضطراب اور یاسیت کی دلدل میں اترنے لگے۔ پانی پت کی جنگ اور احمد شاہ ابدالی کی ہندوستان آمد نے مغلیہ سلطنت کی رہی سہی طاقت بھی ختم کر دی۔ حکام کی نااہلی، اخلاقی گراوٹ ، تعیش پرستی نے مغلیہ سلطنت کے ڈھانچے کو مزید کمزور کر دیا۔ اس دور میں پورا معاشرہ انفعالیت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی دور میں ایک ایسا لایعنی شاعر دکھائی دیتا ہے جو زمانے کا نباض بھی ہے اور سماجیات کا نقاد بھی۔ وہ اپنی ہزلیہ شاعری کے طور پر جانا جاتا لیکن در حقیقت اس نے سماجی آگہی رکھتے ہوئے اپنے دور کی بے معنویت، بے ربطگی اور زوال پذیر معاشرے کی نشان دہی کی ہے۔ وہ طنزیات اور مضحکات میں اپنے محسوسات کو بیان کرنے کا عادی تھا۔

باب نمبر ۹ شمالی ہند میں نئی لسانی روایت، ولی کی کرامت سخن۔۔۔ ریختہ گو شعرا کا عہد

اس باب میں شمالی ہند میں نمو پانے والی نئی لسانیات کا آغاز اور محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دیوان ولی کی آمد سے قبل دور کو ریختہ گو شعرا کا دور کہا جاتا ہے۔ ان شعرا میں مرزا معزالدین محمد موسوی، بیدل، قبول کشمیری، سعد اللہ گلشن، قزلباش خاں امید، نواب امیر خان انجام، آرزو، اور مخلص اور دیگر کے نام شامل ہیں۔ ریختہ کے شمالی ہند میں موجود ہونے کے آثار ان شعرا کے کلام سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جو رفتار زمانہ اور ولی کی آمد کے ساتھ ساتھ زبان کی پختگی میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ محمد شاہی عہد کے نشاطیہ ماحول میں ثنویت نے رجحان پکڑا جس کے باعث ذو معنی الفاظ کا استعمال عام ہوتا نظر آیا جس نے ایہام گوئی کی تحریک کو جنم دیا۔ ایہام گوئی کی تحریک نہ صرف زور پکڑا بلکہ تیس برس سے زیادہ عرصے تک شمالی ہند کی شاعری پر چھائی رہی۔ ایہام گو شعرا میں جن نمائندہ شعرا کے نام نظر آتے ہیں ان میں حاتم، آبرو، محمد شاکر ناجی شامل ہیں۔ ایہام گوئی نے جہاں شعریت کے معیار کو نقصان پہنچایا وہیں زبان و ادب کا دامن نئے الفاظ سے مالا مال بھی کیا۔ ایہام گوئی کے بعد جس نئی شعریات کا ظہور ہوا، اس کا سرخیل مرزا مظہر جانجاناں تھا۔

باب نمبر ۱۰ ادبی روایت کا استحکام۔۔۔ عہد ساز شعرا کا دور

باب دس میں میر اور سودا کے دور کو موضوع بحث بناتے ہوئے دونوں شعرا کے شخصی، تہذیبی، ثقافتی رجحانات کو مد نظر رکھتے

ہوئے ان کے شعری اسلوب کو سامنے لایا گیا ہے۔ دونوں قد آور ہستیاں اٹھارہویں صدی کے شعری ادب پر تناور درخت کی حیثیت سے چھائی ہوئی ہیں۔ میر نے داخلیت کے زور پر انتشار اور زوال پذیر کا نوحہ لکھا تو سودا کے ہاں یہ شہر آشوب کی صورت میں سامنے نظر آیا۔ اس دور میں غزل نئے آہنگ سے ہمکنار ہوا اور رنگ تغزل نکھر کر سامنے آیا جس کے باعث میر کی شعری عظمت بلند ہوتے ہوئے ان کا فرمایا ہوا مستند قرار پایا۔ سودا کے ہاں دھیمی سر اور لے والی غزل نے اپنا جادو جگایا۔ ان کے شہر آشوب، ہجویات، قصائد نے شعری ادب کو ایک نئے افق سے ہمکنار کرایا۔

باب نمبر ۱۱ دبستانِ لکھنو: سیاسی، تہذیبی اور ادبی تشکیل

شجاع الدولہ کی جاں کنی کے ساتھ ہی اودھ کی عسکری طاقت بھی اپنی آخری سانسیں لینے لگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے محدود اختیارات کو لامحدود کرنے کے لیے حکمت عملی شروع کر دی جو شجاع الدولہ کے جانشینوں کی نااہلی کے باعث اپنی عمل داری بڑھانے میں مزید کامیاب ہو گئی۔ کلکتہ کونسل ہر حکمران کی تخت نشینی کے ساتھ اپنی فوج میں اضافہ کرتی رہی۔ اس طرح حکمران محض علامتی کردار بن کر رہ گئے۔ ایسے حالات میں عسکری انفعالیت کا دور شروع ہوا تو مجہول سوسائٹی کا تصور بھی ابھرنے لگا۔ لیکن ان حالات کے باوجود ثقافتی، تہذیبی اور ادبی حوالے سے جو ایک معاشرہ قیام پذیر ہوا وہ انفرادیت کا حامل تھا۔ اس خطے کی اپنی مخصوص تہذیب، تمدن، رنگینی و رعنائی تھی جس میں دلی سے ہجرت کر کے آنے والوں کی تہذیب، نفاست، نزاکت کے اختلاط سے ایک نیا معاشرہ وجود میں آیا جو ثقافتی اور ادبی اقدار کے حوالے سے زرخیز تھا۔ مذہبی حوالے سے اثنا عشری تہذیب کو فروغ ملا جس کے باعث مخصوص ایام میں حزن و یاس کی کیفیت طاری رہنے کے ساتھ ساتھ نوحہ گری اور ماتم پرستی جاری رہتی۔ اس عرصے کے گزرنے کے بعد نغمہ و رقص اور کیف و نشاط کی محفلیں جمنے لگتیں۔ اس دور میں ظاہری وضع قطع، آداب محفل، طرز تکلم، نزاکت و لطافت پر خاص زور دیا گیا۔ لکھنو کی ثقافتی تہذیب میں تعیش پرستی اور معاشی استحکام کی وجہ سے جنس پرستی کا رجحان عام ہوا اور یہ اس تہذیب کا حصہ بن گیا۔ جنس پرستی اور عشقیہ موضوعات شعری سرمائے کا حصہ بنے۔

باب نمبر ۱۲ ادبی روایت کی توسیع: لکھنو ایک نیا ادبی مرکز

اس باب میں ادبی روایت کی توسیع کا تسلسل نظر آتا ہے جس میں لکھنو ایک نیا ادبی مرکز بن کر سامنے آیا۔ اس دور کے نمائندہ شعرا میں میر حسن، مصحفی، انشا اللہ خاں انشا، قلندر بخش جرات، سعادت یار خاں رنگین کا شعری رنگ سامنے آیا۔ رنگین اور اس کے حلقہ اثر کے لوگ جنسی و شہوانی خواہشات کے تابع نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری بھی انھیں جذبات اور خیالات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ رنگین نے ریختی کی صنف کو فروغ دیا جو اودھ کے زوال کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

باب نمبر ۱۳ انیسویں صدی میں اردو زبان کے دو ادارے

۱۔ فورٹ ولیم کالج۔۔۔ ۱۸۰۰ء، سیاست، تاریخ اور اسلوب کی تشکیل

۲۔دلی کالج۔۔۔۔۔۱۸۲۵ء، جدید سائنسی شعوراور ترجمہ کا اہم مرکز

فورٹ ولیم کالج نو آبادیاتی عزائم کے پس منظر میں قائم ہونے والا وہ تاریخی اور تربیتی ادارہ تھا جو کمپنی افسران کے مقاصد کے حصول کے لیے اور ان کی بڑھتی ہوئی سیاسی اختیارات کے انتظام کی تربیت کے لیے قائم ہوا۔ مستشرقین ہندوستانی کی سماجی، سیاسی، معاشی تاریخ سے واقفیت کے لیے یہاں کے ادب میں دلچسپی لینے لگے۔ گل کرسٹ کی ذاتی دل چسپی، انہماک اور کاوشوں نے اردو ادب کی ترقی و فروغ کے لیے نئی راہ ہموار کی۔ سیاسی مقاصد کے لیے تعمیر کیے جانے والا ادارہ ہندوستان میں ایک نئی زبان کو بحیثیت ایک نئی قوت کے سامنے لایا اور جدید اردو ادب کا ذخیرہ سامنے آیا۔ ۱۸۲۵ء میں دلی کالج کا قیام ہوا۔ اس کے محرکات میں بھی کمپنی کے فوائد شامل تھے لیکن یہ ہندوستانیوں کے لیے اس حوالے سے اہم ثابت ہوا کہ یہاں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی علوم کی بھی تعلیم دی جانے لگی اور ذریعہ تعلیم اردو زبان رکھا گیا۔ اردو زبان میں سائنسی کتب کی عدم دستیابی کے باعث "دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" قائم کی گئی یوں ترجمے کی روایت اور بھی توانا ہوئی۔

باب نمبر ۱۴ داستانی ادب کا ظہور

"باغ و بہار"۔۔۔"فسانہ عجائب"

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جب کتابوں کو سلیس نثر میں ڈھالنے کا اہتمام کیا گیا تو گل کرسٹ کی ایما پر میر امن نے "نو طرز مرصع" کو اس طرح "باغ و بہار" کے روپ میں ڈھالا کہ محض ترجمے سے برتر ہو کر اس پر طبع زاد کا گماں ہونے لگا۔ یہاں میر امن کی تخلیقی صلاحیتیں بھی پوری طرح ابھر کر سامنے آئیں۔ "باغ و بہار" کے بعد اردو ادب کی دوسری بڑی داستان "فسانہ عجائب" کو قرار دیا جاتا ہے جو رب علی بیگ سرور کا کارنامہ ہے۔ "فسانہ عجائب" اور "باغ و بہار" اس حوالے سے اہم ہیں کہ جہاں "باغ و بہار" میں دلی کی تہذیب، روزمرہ محاورے، تشبیہات، اور دلی کی فضا مہکتی دکھائی دیتی ہے اسی طرح "فسانہ عجائب" میں لکھنو کی تہذیب، معاشرت، ثقافت، تہذیبی مزاج، رسم و رواج پوری آب و تاب سے چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔

باب نمبر ۱۵ مقامی رنگ اور عوامی روایت کا شاعر: نظیر اکبر آبادی

روایت پرستی کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے شاعری کو ایک نئے آہنگ سے متعارف کروانے کا سہرا نظیر اکبر آبادی کے سر جاتا ہے جنھوں نے عوام کے جذبات، احساسات، خیالات کو اپنی شاعری میں جگہ دے کر اسے عوامی رنگ عطا کیا۔ ان کی شاعری ہر دل کی ترجمان بن گئی۔ ان کی شاعری میں مقامی موضوعات کثرت سے موجود ہیں۔

باب نمبر ۱۶ لکھنو کی نئی شمعیں

دبستان لکھنو میں جس شاعری کی روایت کا آغاز ہوا تھا اسے لکھنو کے چند نمایاں شاعروں نے نقطہ عروج پر پہنچایا۔ ان میں حیدر علی آتش، امام بخش ناسخ، دیا شنکر نسیم، واجد علی شاہ کے رہس شامل ہیں۔ ان کے ذریعے لکھنوی شاعری نئے جہات سے متعارف ہوئی۔

باب نمبر ۱۷　　　　　　　　　دلی میں کمپنی کی عمل داری (۱۸۰۳ء)

باب سترہ میں کمپنی کی سیاسی حکمت عملی اور اس کی ختم ہوتی عمل داری کو موضوع بحث بناتے ہوئے مغل حکومت کے بکھرتے ہوئے شیر ازے کی باقیات کے خاتمے کا بیان کیا ہے۔ انیسویں صدی کا نصف اول بہت سی سیاسی، سماجی تبدیلیاں لیے ہوئے نمودار ہوا۔ اس دور کا سیاسی کینوس بہت وسیع نظر آتا ہے جہاں مغل حکومت کی کمزور ہوتی طاقت ہے جسے اندرونی انتشار اور خلفشار اور کمزور بنا رہا ہے۔ اقتدار کی سیاسی کشمکش میں مغل حکومت کی نمائندگی صرف علامتی یا روایتی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف کمپنی خاموشی اور سیاسی حکمت عملی سے اپنے قدم ہندوستان میں مضبوط کرنے کے لیے مختلف حربے آزمارہی ہے اور مغل حکومت کی اندرونی سازشوں کی وجہ سے کامیابی سے اپنا ہدف طے کرتی ہوئی مغل حکومت کے کمزور ہوتے ستونوں کو پوری طرح سے ڈھا کر مسمار کرنے کی کوشش میں مصروف عمل ہے۔ اس دوران میں کئی برطانوی نمائندے یہاں ہندوستان میں آتے رہے اور اپنے فریضے انجام دیتے رہے۔ جہاں ایک طرف اتنی سیاسی تناو اور کشمکش نظر آتی ہے تو دوسری طرف انگریزوں کے بنائے گئے اداروں کے باعث ادب پنپ رہا ہے۔ ایک نیا دب نامہ افق پر نمودار ہو رہا ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے آنے والے دور کو مستفید کرے گا۔ اس دور میں شعرا کی تخلیقی صلاحیتوں سے ادب کی وسعتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ شاہ نصیر، غالب، ذوق، مومن، ظفر اور دیگر کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری یہاں کی تہذیبی و ادبی بساط کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے لیے وہ جن ماخذات سے رجوع کرتے ہیں وہ زیادہ تر انگریزی زبان میں لکھی گئی کتب ہیں کیوں کہ ہندوستان میں تاریخ نویسی کا آغاز مستشرقین کے ذریعے فروغ پایا۔

باب نمبر ۱۸　　　　　　　　　دلی کی بزم آخر

باب اٹھارہ سترہویں باب کا ہی تسلسل نظر آتا ہے، شاعری کے جن نمائندہ ناموں کا حوالہ باب سترہ میں دیا گیا، ان کے حالات زندگی، شعری محاسن، ان کے کلام کے امتیازات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس دور کے نمائندہ شاعروں کے ساتھ ساتھ معاصرین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ لکھنو کے چند نمائندہ نام بھی پیش کیے گئے ہیں۔ دلی کی بزم کے روشن چراغ جن کی بدولت دلی تہذیب و فن کا گہوارہ بنا اور اپنی ایک الگ پہچان کے باعث دبستان بنا، اس دور میں مختلف توانا آوازیں ابھریں جن میں درد مندی، سوختگی، لطافت، راز و نیاز، سرور، سوز و گداز جیسی خصوصیات نظر آتی ہیں لیکن ان میں غالب کا غلبہ دوسری آوازوں پر غالب رہا۔ شیفتہ جو غالب کے پیش رو میں شامل تھے ان کی وفات کے ساتھ ہی دہلی کے اس طرز حسن اور سخن کا خاتمہ ہو گیا۔

باب نمبر ۱۹　　　　　　　　　اردو مرثیہ: لکھنو کی مذہبی ثقافت کا ایک مظہر

باب انیس میں لکھنو کی تہذیب و ثقافت کو موضوع بناتے ہوئے یہاں پر فروغ پانے والی ادبی صنف، مرثیے کا آغاز اور تقابیان کیا ہے۔ مرثیے کے لیے جن عوامل کی ضرورت تھی وہ اسے لکھنو کی تہذیب میں خوب میسر آئے۔ میر انیس اور مرزا دبیر مرثیے کے دو اہم ستون ہیں۔ مرزا دبیر کی وفات کے بعد اور انجمن پنجاب کے قیام کے بعد مرثیے کا وہ مقام و مرتبہ باقی نہ رہا جو میر انیس اور مرزا دبیر کی

صحبت نے اسے عطا کیا تھا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ کے بنیادی پہلو ان کی محققانہ نگاہ کے ساتھ ساتھ تنقیدی بصیرت کو نمایاں کرتی ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ادبی تاریخ کی تشکیل کرتے وقت استقرائی طریقہ کار اختیار کرتے وقت حقائق کو نہ صرف طے شدہ نظریات کے تحت پرکھا ہے بلکہ اس کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ان کے ہاں نفسیاتی تجزیے بھی نمایاں ہیں س کے تحت انھوں نے مختلف شعرا اور دبستانوں کے تجزیے بیان کیے ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے شخصی کیفیت کے تجزیے کے ساتھ نفسیات کا بھی خاص طور پر تجزیہ کرتے وقت ہر شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کی قوت محرکہ کو بھی تلاش کیا ہے۔نا ں میٹلجیک عنصر بھی مد نظر رکھتے ہوئے تخلیقی سر چشموں کے منبع کی تلاش کے بعد ان پر وقیع نگاہ ڈالتے ہیں۔ قلی قطب شاہ کی شاعری کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے نفسیاتی تجزیے سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ قلی قطب شاہ کی شاعری کا محرک جنس ہے۔ قلی قطب ایک دل پھینک عاشق بھی تھا۔اس نے اپنی تہذیب کو بھی عشق اور جنس کے استعارے سے تعبیر کیا ہے۔اس کے ہاں زندگی کا ہر تجربہ عیاں ہے، جہاں مختلف کردار اپنے خوب صورت ملبوس اور حسین بدنوں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں، جن سے وہ حظ اٹھاتا ہے۔برسات کے موسم میں بادل، بارش اور بجلی قلی قطب شاہ کی شاعری میں جنسی ہیجان تیز کرنے کا باعث ہیں۔اس نے حسن کو ہزار شیووں سے دیکھ کر دس ہزار شیووں سے اس کا اظہار بھی کیا۔ جنس کا اظہار اس کے لیے عیب نہیں تھا۔(۹)

نظیرؔ کے ہاں بھی عشق میں شوخی، چھیڑ چھاڑ، بانکپن، جنسی آرزومندی اور شباب و نشاط کی حالتیں ملتی ہیں۔ذہنی طور پر لکھنو کی فضا کے اثرات نظیرؔ پر چھائے نظر آتے ہیں، جو عشق میں تلذذ کے سارے امکانات کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ نظیر کی عشقیہ شاعری میں جنسی واردات کے بے شمار منظر موجود ہیں۔اس حوالے سے قلی قطب شاہ، نظیر کا پیش رو دکھائی دیتا ہے جو بدنی حسن کی کشش سے بدمست ہے۔ عشق کے اظہار میں اس کے ہاں جرات ،بے باکی اور رندی مشرب نظر آتا ہے۔نظیر دل کے ساتھ نگاہ کا شاعر بھی ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری میں بھی جنسی حساسیت واضح طور پر موجود ہے۔ ظفر کی غزل میں متعلقات پرستی(FETICISM)کی بیشتر مثالیں موجود ہیں۔(۱۰)

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہے کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس تاریخ کو مرتب کرتے وقت تاریخ کے کسی پہلو پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ عہد قدیم کے حکمرانوں کی تعیش پرستی یا شعرا کے جنسی رجحان، کسی بھی پہلو کو سامنے لاتے ہوئے کوئی بھی حجاب مانع نہیں ہوا۔ انھوں نے اس حوالے سے شعرا کی نفسیات کو بھی مد نظر رکھا ہے۔اس رجحان کے قوت محرکہ کو تلاش کر کے اس بات کو واضح کیا ہے کہ ان اثرات کے غالب آنے کی وجہ کیا بنی۔ شعرا کی نفسیات، ان کے جنسی رجحان سب چیزوں کو کہانی کے انداز میں بیان کرتے ہوئے ان کے کلام میں موجود وہ تمام محرک سامنے لائے ہیں جن سے ان شعرا نے جنسی تلذذ اٹھایا ہے۔اس طرح ان کے اشغال و افعال کی جھلک بھی عیاں کی ہے۔ شخصی خاکہ کشی میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری ملکہ رکھتے ہیں۔انھوں نے شخصی کیفیات کو جانچتے وقت خارجی عوامل کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ باطنی عوامل کو بھی مد نظر رکھا ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا کی شخصیت بیان کرتے وقت ان کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر، ان کی ذہنی پستی کا ایک منظر نامہ بیان کرتے ہیں کہ وہ انسانوں کو حقارت سے دیکھنے کے عادی تھے۔ان کی انا اور بے جا تفخر کو یوں بیان کیا ہے:

"شخصی طور پر وہ حد سے بڑھی ہوئی خود پسندی (Egotism) میں مبتلا تھے لہذا جب بھی ان کی خود پسند (egotist) شخصیت کو ذرا سی بھی ٹھیس لگتی تھی وہ مشتعل ہو جاتے تھے۔(۱۱)

سودا خود پسندی کی وجہ سے مسلسل اضطراب اور اذیت کی کیفیت میں رہتے تھے اسی طرح میر کی شخصیت اور ان کی جنونی کیفیت بیان کرتے وقت ان کی نفسیات کا جائزہ اس انداز میں لیتے ہیں:

"یہ خیال کہ چاند سے ایک خوب صورت خاتون کا پیکر اتر کر میرؔ کی طرف آتا تھا، جسے آخر شب تک صحبت رہتی تھی۔ میرؔ کا خبط (obsession) تھا۔ نفسیات کے مطابق یہ Paranoia کی صورت تھی۔ ایسی کیفیت میں ذہنی حالت کی تبدیلی یا خلل کے سبب مریض کے ذہن میں ایسے خیالات آتے ہیں جو اس کے اپنے بس میں بالکل نہیں ہوتے۔ اس نے ذہن پر ایسے متخیلہ کا بھرپور قبضہ ہو جاتا ہے اور وہ اگر کوشش کرے تو اس سے رہائی پانا آسان نہیں ہوتا۔"(۱۲)

یہی کیفیات ہمیں میرؔ کے عالم جنون کے بارے میں مثنوی "خواب وخیال" میں ان کی اپنی زبانی دکھائی دیتی ہے کہ چاندنی رات میں خوش صورت پیکر کمال خوبی سے میری طرف بڑھتا اور مجھے بے خود کر دیتا۔ جدھر میری نگاہ اٹھتی، جس طرف بھی دیکھتا مجھے اسی رشک پری کا پیکر نظر آتا۔(۱۳)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا تجزیاتی دائرہ کار صرف افراد تک محدود نہیں بلکہ وہ پورے عہد کی سماجی و معاشی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تہذیبوں کا مطالعہ بھی پیش کرتے ہیں۔ لکھنوی تہذیب کی سماجیات، معاشیات اور مذہبی اقدار کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس تہذیب کی یوں منظر کشی کرتے نظر آتے ہیں:

"کسی بھی قوم یا گروہ کے لیے تہذیب وثقافت کے اعلیٰ معیارات کے حصول کے لیے کم سے کم تین چیزوں کی ضرورت بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ وقت، ذوق اور پیشہ۔ اودھ کے مذکورہ بالا گروہ میں اتفاق سے یہ تینوں چیزیں بدرجہ کمال موجود تھیں۔ وہ معاش سے بے فکر تھے، اس لیے وقت اور فرصت کی کوئی کمی نہ تھی، ذوق ان کی طبع میں موجود تھا اور پیشہ وافر تھا۔ لہذا ان تینوں عوامل نے لکھنو کے اندر تفریحی ثقافت کی اعلیٰ نفاستوں کے معیارات قائم کیے۔ فرصت کے سبب یہ لوگ جنس کی طرف مائل ہوئے۔ ان کے شب وروز عیش ونشاط کی نذر ہوتے تھے۔ انھوں نے جنس کو بھی تہذیب وثقافت کا ایک مظہر بنا دیا۔"(۱۴)

لکھنوی تہذیب میں نشوونما پانے والی اس جنسی ثقافت کا اثر نہ صرف عوام پر، ادب پر نظر آیا بلکہ وہاں کے حکمران، نواب، امرا اور رئیس اس ثقافت کے پروردہ نظر آتے ہیں۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی جنسی خواہشات اور شہوانی جذبات نے ان کو زیر کر دیا تھا۔ وہ اپنی سرمستی میں ہی مدہوش نظر آتے ہیں۔ عسکری فعالیت بھی ان حالات سے متاثرہ نظر آتی ہے اور یہ عسکری فعالیت گرتے ہوئے مجہول عسکری انفعالیت کا شکار نظر آتی ہے۔ ان عوامل کے زیر اثر پنپنے والا ادب روایات سے منحرف دکھائی دیتا ہے جس کے باعث ریختی کا وجود

سامنے آتا ہے۔اس عہد میں مردوں کی عورت سے بے زاری اور عورت کے مسائل اور ہم جنسیت کے عناصر اخلاقی لحاظ سے اس معاشرے کو پستہ اور خستہ بنادیتے ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس مسئلے پر یوں اپنی رائے پیش کرتے ہیں:

"لکھنو کی عورت اس نوعیت کی نفسیاتی کیفیات کا شکار اس لیے بھی ہوئی تھی کہ مردوں کی کثیر تعداد گھریلو عورتوں کی جگہ طوائفوں سے جنسی ملاپ کو زیادہ پر مسرت محسوس کرتی تھی،لہذا گھروں میں جنسی ناآسودگی میں مبتلا عورتیں ہم جنسیت میں مبتلا ہو کر جنسی سکون کا مرحلہ طے کرتی تھیں۔"(۱۵)

اسی جنسی ناآسودگی اور جنسی گھٹن کا اظہار ادب پر گہری چھاپ بن کر ریختی کے ذریعے سامنے آتا ہے جہاں عورت جنس زدہ ہے۔اس تہذیب میں پروان چڑھنے والے جو شاعر نظر آتے ہیں وہ تمام اپنی شاعری میں ان جبلتوں کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کا انداز جرات مندانہ،بے باکانہ اور کہیں عامیانہ،سوقیانہ دکھائی دیتا ہے۔لیکن یہ تمام چیزیں لکھنو کے ثقافتی ماحول میں فنون لطیفہ کی حیثیت اختیار کرتے ہوئے جنسِ انسانی کی جبلتوں کا اظہار سمجھا گیا۔یہ معاشرہ ثقافتی طور پر حرکی تصور کیا جانے لگا لیکن عسکری حوالے سے مجہول صورت اختیار کر گیا۔حکمران اپنی تعیش پرستی اور کمزوری کے باعث کمپنی کے ماتحت آتے گئے۔کمپنی کی شرائط اور پابندیوں نے حکومتی امور میں ان کا کردار نہایت محدود کر دیا۔ان کی حیثیت ایک علامتی کردار کی طرح بن گئی جسے کٹھ پتلی کی طرح چلایا جاتا تھا۔

یہاں کا معاشرہ دو انتہاؤں پر پنپتا نظر آتا ہے۔ایک طرف تو جنس پرستی کے فروغ پاتے رجحانات،تو دوسری طرف اودھ کے بانی نواب برہان الملک کے توسل سے اثنا عشری کو فروغ ملا۔(۱۶)جو لوگ غیر شیعہ تھے وہ بھی یہاں کا سازگار ماحول،اس کے ثمرات و اثرات کو دیکھ کر شیعہ ہو گئے۔یوں لکھنو کی تہذیب جس میں تصوف کا کوئی عملی دخل نظر نہیں آتا تھا،شیعیت کے گہرے رنگ سے آہنگ ہو گئی۔ایسے ماحول میں جس تہذیب کا ڈھانچہ تیار ہوا وہ اپنی ثقافتی،سماجی،ادبی،مذہبی حوالے سے ایک جداگانہ انفرادیت کی حامل نظر آتی ہے۔

ادب کا رنگ بھی یہاں کے معاشی،سیاسی،سماجی اور مذہبی اقدار کے باعث اس سے متاثرہ نظر آیا جس کے اندر زندگی کی لطافتیں ،رعنائیاں،شادمانی،جذبات نگاری،جبلی تمثالوں کا واضح اظہار ملتا ہے۔ان اثرات کے زیر اثر جو ادب و تہذیب پروان چڑھی اسے عورت کی تہذیب کہا جاسکتا ہے جو ریختی کی صورت میں نمودار ہوئی۔لکھنوی تہذیب کے نمائندہ شاعر جن کا نفسیاتی تجزیہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے پیش کیا ہے ان میں انشا،جرات اور رنگین شامل ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری حقائق کی روشنی میں بہت سے اہم پہلو اجاگر کرنے کے ساتھ تسامحات کو بھی دور کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ان کے نزدیک دبستان لکھنو کو جس تعصب کا سامنا ہے اس کی وجہ ہمارے نقاد ہیں جن میں شمالی ہند کے نقاد زیادہ متحرک رہے۔لکھنوی دبستان کے معروضی مطالعے اور تاثراتی تنقید نے اس کے مقام و معیار کو نقصان پہنچایا ہے ،ڈاکٹر صاحب اس کا تدارک کرنا چاہتے ہیں۔ان کے نزدیک جو اصل شعری کلیت جو اس تہذیب کی وجہ سے دریافت ہوئی وہ اس کے تہذیبی پس منظر میں کہیں نیچے دب کر رہ گئی۔جہاں اس تہذیب میں ظاہری وضع قطع،شان و تمکنت کو فروغ ملا وہاں ادب میں زبان کو

بھی جلا ملی اور صحت زبان کے ساتھ ساتھ لطافت ونزاکت بھی ادب کی روح بنے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھنو کے ثقافتی اور سماجی تناظر میں عشق اور جنس جیسے موضوعات کو معیوب نہیں سمجھتے لیکن مبتذل شاعری کو قبول بھی نہیں کرتے۔ لکھنو کی شاعری کو صرف عشق اور جنس پرستی تک محدود کرنا ان کے نزدیک کسی صورت صحیح نہیں ہے۔اس تہذیب کو دوسری تہذیبوں کے تقابل کرنے سے اس تہذیب کی اصل صورت اور وقار مجروح ہوتا ہے کیوں کہ یہ تہذیب مختلف عسکری، سماجی اور سیاسی حالات میں پروان چڑھی۔اس میں دلی سے مہجور شعرا اور لوگوں کے آنے سے دہلوی رنگ کی آمیزش بھی ہوئی لیکن اس کے باوجود اس کی انفرادیت برقرار رہی۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو یہ واضح ہے کہ انھوں نے لکھنوی تہذیب کی بنیاد، تشکیل، فروغ، ارتقا اور زوال تمام پہلو کو مختصر مگر جامع طور پر مرحلہ وار سامنے لانے کی کوشش کی ہے کیوں کہ اس تہذیب کی بنیاد مختلف ستونوں سے مل کر ہوئی ہے اس کی تاریخی حوالے سے الگ حیثیت ہے اور یہ اس تصور کو بدلنے کی کاوش ہے جو لکھنوی دبستان کے ساتھ عامیانہ اور سوقیانہ بنا کر منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہاں کے شعرا کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی بصیرت، ذوقِ جمال، حسیات کو بنظر غائر دیکھتے ہوئے ان کی اہمیت کو گردانتے بھی ہیں اور ان کے صحیح مقام اور مرتبے کا تعین کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ان کے نزدیک دبستان لکھنو کو دبستان دہلی کے معیاروں پر پرکھنا کسی صورت انصاف کے اصولوں کے مطابق نہیں ہے۔ڈاکٹر صاحب حقائق کو سامنے لاتے ہوئے دونوں دبستانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد تقابلی تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین ان آرا کی روشنی میں ان کی روح کو سمجھنے کے قابل ہو سکے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اردو ادب کی تاریخ کو لکھتے وقت تقلیدی رویے سے گریز کیا ہے۔انھوں نے استقرائی طریقہ تحقیق کے ساتھ ساتھ استخراجی طریقہ بھی اختیار کیا ہے۔انھوں نے نہ صرف شاعروں کے کلام اور شعری امتیازات کا تقابل کیا ہے بلکہ اپنے تحقیقی و تنقیدی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف تواریخ میں پیش کیے جانے والے حقائق کا تقابل پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر صاحب ہر عہد کی تصویر کشی متعلقہ عہد کی ضروریات وحالات کی روشنی میں کرتے ہوئے متوازن رائے قائم کرتے ہوئے تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں اور ہر عہد کے نمائندہ لوگوں کا تقابلی جائزہ بھی پیش کرتے ہیں، جس سے ان کا مزاج سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> "اکبر اور قلی قطب شاہ کا عہد ایک ہی تھا۔ قطب شاہ عیش وطرب اس کا زیست تھا جب کہ اکبر تلوار ودربار کا دھنی تھا۔"(۱۷)
>
> "وجہی اور قلی قطب شاہ ہم مذاق وہم مزاج تھے۔دونوں رند مشرب، آزاد خیال اور عیش پیشہ شاعر تھے۔"(۱۸)
>
> "میر ایک ایسی داخلی دنیا کے اندوہ کا شاعر ہے کہ جہاں کسی دوسرے شاعر کے لیے سانس لینا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ان کے نامختتم غم والم، حزن ویاس اور آہ وفغاں کے دھوئیں سے دم گھٹنے لگتا ہے۔۔۔اس کے مقابلے میں سودا ایک خوش رنگ اور خوش دل شاعر ہیں۔۔۔ان کے پاس ایک

ایسا دل ضرور موجود تھا جو زندگی کی وسعتوں، شباب کی منزلوں اور حسن و عشق کی لامحدود کیفیات کا تجربہ کر سکتا تھا۔"(۱۹)

"جن منزلوں کی طرف ظفر کا قدم بڑھتا ہے، ذوق ان منزلوں کا شاعر ہی نہیں ہے۔ ذوق کے ہاں نازک خیالی اور تمثیلی شاعری کے پیرائے میں ہے لیکن ظفر کے ہاں عشقیہ شاعری کے اسالیب اور موضوعات موجود ہیں۔ ذوق روزمرہ عوامی اور عمومی تجربوں کے ساتھ عوامی زبان کا شاعر ہے جبکہ ظفر رومانوی طرز احساس کا شاعر ہے۔"(۲۰)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری شعرا کا ادبی مقام و مرتبے کا تعین کرتے ہوئے دیگر نقادوں کی رائے کو بھی مد نظر رکھتے ہیں۔ جہاں ان کی رائے سے اتفاق ہو، وہاں تائید کرتے ہیں اور جہاں اختلاف ہو وہاں دلائل و براہین کی روشنی میں اپنی بات کرتے ہیں۔ مثلاً شیفتہ کے ادبی شخصیت اور مقام و مرتبے کے بارے میں بیان کرتے ہوئے اس افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمارے نقاد نے ان کی انفرادی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا گیا اور انھیں ہمیشہ غالب و مومن کے سائے میں رکھتے ہوئے ان کا طفیلی سمجھا گیا ہے۔ اس حوالے سے وہ چند نقاد کی رائے بھی پیش کرتے ہیں جنھوں نے ان کا مقام و مرتبہ تعین کرتے وقت متوازن رائے قائم نہیں کی۔

"اردو اشعار گو بہت اعلیٰ درجے کے نہ سہی مگر بلند مضامین صاف اور بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔

دوسرے درجے کے شعرا میں درجہ ممتاز ہے۔" (رام بابو سکسینہ)

"وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے باوجود کبھی مقبول نہ ہو سکے۔" (احتشام حسین)

"دوم درجے کے شعرا میں بلند مقام حاصل ہے۔" (علی جواد زیدی) (۲۱)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں شیفتہ کے ساتھ یہ زیادتی "آب حیات" سے لے کر دیگر ادبی تواریخ میں روا رکھی گئی ہے کہ انہیں ان کے جائز مقام و مرتبے سے محروم کیا گیا ہے۔ جبکہ حسرت موہانی کی رائے پیش کرتے وقت ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ بیسویں صدی میں یہ کام حسرت نے کرنا شروع کیا کہ ان کے شعری معیار کو صحیح طور پر جانچا اور پرکھا۔(۲۲) پھر اس بازیافت سے بہت سے لوگ شیفتہ کی تنقیدی بصیرت کے قائل ہوئے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اردو ادب کی تاریخ کو مرتب کرتے وقت ان تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا جو اس سے قبل کی تاریخ میں رقم ہونے سے رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ کئی حوالوں سے ان سے قبل لکھی جانے والی تواریخ سے بہتر ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس سے قبل مولانا محمد حسین آزاد کی "آب حیات" (مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اشاعت: ۱۹۷۰ء) اور رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" کو حواشی، تعلیقات اور مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر چکے تھے۔ ان کے سامنے ادبی تاریخ کے اولین نقوش موجود تھے۔ اورینٹل کالج سے وابستہ ہونے کے باعث وہاں کا علمی و ادبی ذخیرہ بھی آپ کے سامنے موجود تھا اور ۱۹۶۵ تا ۱۹۸۱ تک شعبہ تاریخ ادبیات سے منسلک رہنے کے باعث تاریخ نویسی کے اصول بھی پیش نظر تھے۔ جاپان میں تدریسی سلسلے کے قیام کے دوران

جب اردو ادب کی تاریخ لکھنے کا مرحلہ درپیش تھا تو پروفیسر سویامانے کے توسط سے اور اپنے تعلقات کی بنا پر انھوں نے لندن لائبریری اور ہندوستان سے بھی ماخذات اکٹھے کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دیگر ادبی تواریخ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ لیکن وہ خود چوں کہ فرانسیسی تاریخی سکول سے متاثر تھے ،اس لیے جدید تاریخ نویسی کے اصول سے واقف تھے اور ان اصولوں کو انھوں نے تاریخ لکھتے وقت برتنے کی کوشش کی ہے۔ فرانسیسی ادبی تاریخ کے حوالے سے گارساں دتاسی کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندی وہندوستانی، ادبی تاریخ کے حوالے سے ایک اہم سنگ میل ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی اردو ادب کی تاریخ میں کہیں بھی اس کا حوالہ شامل نہیں ہے۔ نہ ہی اس سے اخذ واستفادہ کا حوالہ نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ پڑھتے ہوئے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا کیوں کہ انھوں نے ادبی اور تاریخی دونوں اسلوب برتے ہیں۔ تاریخ کو پڑھتے ہوئے داستانوی رنگ وآہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تاریخ داستان اور ناول کے سنگم پر کھڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ وہ دیباچے میں خود بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۹۴ء میں جاپانی طلبہ کی اردو کی ادبی تاریخ کو جاننے کی خواہش پر اس کام کا آغاز ہوا۔ ان کے لیکچرز کے لیے بہت سی تواریخ کو کھنگالنا پڑا اور مآخذ تلاش کرنے پڑے۔ ان کو پڑھانے کے لیے داستانوی انداز اپنا کر دل چسپ اور پر لطف بنایا تاکہ طلبا اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں اور ان کی دلچسپی آخر تک برقرار رہے اور طلبا نے کمال محبت اور ذوق وشوق سے دلجمعی کے ساتھ پڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تاریخ کو کتابی صورت میں لاتے ہوئے ان کے سامنے یہی توجیح تھی کہ قاری کی دلچسپی برقرار رہے اور وہ تاریخ جیسے خشک موضوع سے اکتاہٹ کا شکار نہ ہو۔ اسے لیے ان کا انداز بیاں سہل اور رواں نظر آتا ہے۔ قاری کی دلچسپی اور دلجمعی کا سامان کرتے ہوئے وہ ایک بڑے تخلیق کار کی طرح قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ، مبصرین کی نظر میں:

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تخلیقی، تجزیاتی وتنقیدی بصیرت اور ان کے اسلوب کے بارے میں مبصرین ان کی کاوشوں کو سراہتے ہیں ۔ڈاکٹر محمد حسن اس تاریخ کے شگفتہ اسلوب کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "جو بات اس تاریخ کی دل آویزی میں اضافہ کرتی ہے وہ اس کا شگفتہ اسلوب ہے جو تحقیق کی خشکی کے بجائے ادبی تاریخ میں تفہیم اور تجزیے کی روشنی پیدا کرتا ہے اور مصنف کی تاریخ، تحقیق اور تنقیدی شعور تینوں کے مزاج سے نیا مرکب تیار کرتا ہے۔ یہی نہیں اس ضمن میں بعض ادبی تصانیف کے سلسلے میں تخلیقی تنقید کا اسلوب بہت ہی دل کش اور بلیغ ہے۔" (۲۳)

ڈاکٹر فخر الحق نوری ان کے اسلوب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> "اردو ادب کی تاریخ اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی جاذب توجہ ہے۔ تبسم کاشمیری نے ادبی تاریخ لکھتے ہوئے ایسا علمی طرز نگارش اختیار کیا ہے جس میں مناسب مقدار میں مذکورہ پہلوؤں کی آمیزش بھی محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے تکلف سے عاری اور دل چسپی پیدا کرنے والے عناصر سے معمور

سلیس اور رواں دواں انداز تحریر اپنایا ہے جس نے علمی عبارت کو بوجھل اور ثقیل ہونے سے محفوظ کر دیا ہے۔"(۲۴)

ڈاکٹر ریاض قدیر اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے یوں اپنی رائے پیش کرتے ہیں:

"اردو ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مصنف ایک عرصہ برصغیر پاک وہند کے ماضی کی ادبی وثقافتی دنیا میں کھویا رہا ہے۔ تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا ہے ماضی کے کرداروں کے ساتھ اٹھا بیٹھا ہے۔ بیجاپور، گولکنڈہ، گجرات دلی اور لکھنو کے تاریخی مقامات گلیوں اور محلوں میں گھوما پھرا ہے۔ پھر ان مقامات اور افراد کے احوال و واقعات کی تصویریں اس طرح کاغذ پر کھینچ کر رکھ دی ہیں۔"(۲۵)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ جہاں تعریف و تحسین کی مستحق ٹھہری وہاں کچھ نقادوں نے اس پر اعتراضات بھی اٹھائے۔ ان کے خیال میں اس تاریخ میں جنس نگاری کے پہلو کو زیادہ بلیغ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریوں اور لکھنوی شاعروں کی جنسی شاعری کو موضوع خاص بناتے ہوئے اس کا بیان بڑے پر کیف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے تبسم کاشمیری یوں بیان کرتے ہیں کہ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس نے (قلی قطب شاہ) ہمارے ادب کو سچ بولنے کا سلیقہ اور حوصلہ دیا ہے۔ (۲۶)

اسی طرح ڈاکٹر محمد حسن نے ایک جگہ ان کے جانبدارانہ رویے کے بارے میں یوں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"تبسم کاشمیری صاحب نے بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہو یا نہ کیا ہو وہ مصحفی، جرات اور بعض دوسرے شاعروں کے زیادہ قائل ہیں اور اس لیے ان پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔"(۲۷)

اس رائے کی روشنی میں جب ہم اردو ادب کی تاریخ کے اس حصے کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ تاثراتی بیان محسوس ہوتا ہے۔ دبستان لکھنو، اس کی شاعری، روایت تمام چیزوں کا ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی نگاہ سے دیکھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس تعصب یا اس تاثر کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کے عامیانہ اور مبتذل حصے کے باعث بحیثیت مجموعی دبستان لکھنو کو اس تاثر میں پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا وژن وسیع اور کشادہ ہے اور انھوں نے اس کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف ادبی تحاریک اور میلانات کو سمیٹتے ہوئے اردو کی ادبی تاریخ میں کلیت اور وحدت کی حیثیت سے یکجا کیا ہے۔ ان کی قوت متخیلہ نے جہاں تاریخ کے اوراق پر مختلف رنگ بکھیرے ہیں وہیں تکنیکی تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے حقائق کی صحت کو مشکوک نہیں ہونے دیا۔ اس کو بے جا طوالت اور بوجھل ہونے سے بچانے کے لیے مختصر اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ اشعار کا انتخاب ان کے شعری ذوق کے اعلیٰ معیار کا عکاس ہے۔ ان اشعار کے ماخذات کی نشان دہی البتہ محقق یا ادب کے طالب علم کے لیے سوال اٹھاتی ہے کہ اگر ان اشعار کے حوالے دے کر ماخذات کی

نشان دہی بھی کر دی جاتی تو وہ اس کو مزید وقیع بناتی۔ بحیثیت مجموعی ایک ادبی مورخ کے طور پر جدید رجحانات کی بنیاد پر، ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اسے مرتب کیا ہے جو ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ کے بعد باقاعدہ ادبی تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔ ان کی قابل قدر کاوش کی تحسین نہ کرنا قرین انصاف نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اردو ادب کی تاریخ پر بے شمار تبصرے اور آرٹیکل لکھے جا چکے ہیں۔ ہر مبصر نے اپنے ادبی شعور کے مطابق اس کا تجزیہ پیش کر کے رائے قائم کی ہے جو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ کو زیادہ وقیع بناتی ہے، ان مقالہ جات میں چند یہ ہیں جو مختلف مجلوں کی زینت بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا ادبی، تحقیقی، تنقیدی، تجزیاتی شعور کتنی وسعت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تاریخ چند خامیوں اور کمی کے باوجود جدید سائنٹیفک ادبی تاریخ نویسی کی طرف موثر قدم ہے جو اردو ادب کی تاریخ کو عالمی تناظر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہے اور آنے والے ادبی مورخین کے لیے اہم سنگ میل ثابت ہو گی۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۱۴

۲۔ ایضا، ص:۹

۳۔ ایضا، ص:۹

۴۔ ڈاکٹر عامر سہیل، نسیم عباس، مرتبین: ادبی تاریخ نویسی، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۱ء، ص:۸۷

۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو ادب کی تاریخ، جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء، ص ۴۶۹ تا ۷۲۲

۶۔ تاریخ اودھ، ۳۶۰، ۳، بحوالہ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، ص:۳۰۱

۷۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، ص:۲۹

۸۔ حافظ محمود شیرانی، مقالات شیرانی، مرتب: مظہر محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب (جلد دوم)، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص:۳۰۳

۹۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، ص:۱۶۶

۱۰۔ ایضا، ص:۱۷۷

۱۱۔ ایضا، ص:۳۰۷

۱۲۔ ایضا، ص:۳۱۶

۱۳۔ ایضا، ص:۳۱۶

۱۴۔ ایضا، ص:۳۸۹، ۳۸۸

۱۵۔ ایضا، ص:۴۷۱، ۴۷۰

۱۶۔ ایضا، ص:۳۸۴

۱۷۔ ایضا، ص:۱۵۴

۱۸۔ ایضا، ص:۱۶۸

۱۹۔ ایضا، ص:۳۰۲،۳۰۱

۲۰۔ ایضا، ص:۷۶۸

۲۱۔ ایضا، ص:۷۹۲

۲۲۔ ایضا، ص:۷۹۶

۲۳۔ڈاکٹر عامر سہیل، نسیم عباس احمر، ادبی تاریخ نویسی، مرتبین، ص:۴۵۴

۲۴۔ خادم حسین،ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نویسی اور ادبی تاریخ کے نئے تصورات، مشمولہ بازیافت، شمارہ۳۵، جولائی تا دسمبر ،۲۰۱۹ء، ص:۹۸

۲۵۔ ڈاکٹر ریاض قدیر، اردو ادب کی تاریخ اور تاریخی وژن، مشمولہ مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، جلد:۸۶، ۲۰۱۱ء، ص:۱۰۰

۲۶۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، محولہ بالا، ص:۱۶۱

۲۷۔ ڈاکٹر محمد حسن، اردو ادب کی تاریخ: تبسم کاشمیری، مشمولہ، ادبی تاریخ نویسی، مرتبین عامر سہیل، ڈاکٹر، نسیم عباس احمر ،لاہور، پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء، ص:۴۳۷